اداریہ

حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء

۱۹۷۹ء میں مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے 'حدود آرڈیننس' کے نام سے ایک فرمان جاری کیا۔ جس کی رُو سے پاکستانی معاشرہ میں رونما ہونے والے سماجی جرائم کا فیصلہ شرعی احکام کے مطابق لازمی قرار دیا گیا۔ مثلاً چوری، زنا یا قذف (دوسرے پر جھوٹی تہمت لگانا) جیسے جرائم کے فیصلے کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابق ہوں گے۔ تاکہ ملک میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو اور سوسائٹی کو جرائم سے نجات ملے۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ آج کل اسی 'حدود آرڈیننس' کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اس کے نفاذ سے سماجی جرائم میں کمی نہیں، اضافہ ہوا ہے۔ خواتین کو دُکھوں نے گھیر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ حدود آرڈیننس کے خلاف برابر احتجاج کر رہی ہیں۔ خواتین کا یہ احتجاج مروّجہ حدود آرڈیننس کے خلاف ہے، حدود اللہ کے خلاف نہیں۔ دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ حدود اللہ اپنی سرشت میں لاہوتی (Divine) ہیں، اور حدود آرڈیننس ایک طریقِ کار ہے جسے انسانی فکر نے وضع کیا ہے۔ حدّ آج فقہی زبان میں ایک متعین سزا (Fixed Punishment) کا نام ہے اور 'حدود اللہ' (اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیاں) کا بنیادی مقصد معاشرے میں جرائم کو روکنا اور عدل و انصاف کا قیام ہے۔ صد افسوس! حدود آرڈیننس معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام میں ناکام رہا۔ سماجی جرائم میں نہ صرف کمی نہیں ہوئی، بلکہ یہ جرائم اور بڑھ گئے۔ مثلاً ۲۰۰۱ء میں حدود آرڈیننس کے تحت جو مقدمات ریکارڈ کیے گئے، ان کی تعداد 75,943 تھی، لیکن مقدمات کی یہ تعداد ۲۰۰۲ء میں بڑھ کر 82,545 تک پہنچ

گئی۔[۱] یاد رہے کہ اس عرصے میں جو لوگ ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے اور مجرم قرار پائے، ان کی تعداد ان ملزموں سے زیادہ تھی جنہیں عدالت نے بری کر دیا تھا۔ چنانچہ اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال پر برابر آوازیں اُٹھتی رہیں کہ اس طریقِ کار کو بدلا جائے جس کی وجہ سے خواتین حدود اللہ کی غلط تعبیر سے وقف حرماں و یاس بن کر رہ گئی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر مسلم ملک میں شریعتِ اسلامیہ کا اطلاق جو اپنے مزاج میں آفاقی ہے، اس ملک کے رسم و رواج اور سماجی احوال کے مطابق عمل میں آیا ہے، اس مسئلہ پر مرحوم شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: ''اسی طرح شریعت میں اُن علوم اور اعتقادات و عادات کا لحاظ کیا جاتا ہے جو قوم میں مخزون اور جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ جو بنی اسرائیل پر حرام ہوا، بنی اسماعیل پر حرام نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور ناپاک کی تفریق عرب مذاق (عرب رسم و رواج) پر رکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے، یہود کے ہاں نہیں۔''[۲]

اسی بحث میں شاہ صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

''جاننا چاہیے، بہت سے مراسم اور علوم ایسے ہیں جن میں تمام عرب و عجم اور تمام معتدل ممالک کے رہنے والے اور تمام وہ لوگ جن میں اخلاقِ فاضلہ کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے، سب متفق ہوئے۔ مثلاً مردے کا غم کرنا، اوروں پر رحم کھانا، یا حسب و نسب پر فخر کرنا، تو یہ مراسم اور یہ اصول سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔ ان کے بعد وہ مراسم (رسم و رواج) ہیں جو خاص اسی قوم میں جاری ہیں، جن میں وہ پیغمبر مبعوث ہوا ہے۔ (غرضیکہ) ان مراسم کا لحاظ کیا جاتا ہے۔''[۳]

''پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے اس کی شریعت میں اس قوم کے عادات و خصوصیات کا خاص طریقہ پر لحاظ ہوتا ہے۔ لیکن جو پیغمبر تمام دُنیا کے لیے مبعوث ہو، اس کے طریقِ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا۔ کیوں کہ نہ وہ تمام دُنیا کی قوموں کے لیے الگ الگ شریعت بنا سکتا ہے، نہ ہی تمام قوموں کی عادات و خصوصیات باہم متفق سکتی ہیں۔ اس لیے وہ

پہلے اپنی قوم کی تعلیم و تلقین شروع کرتا ہے اور ان کو محاسنِ اخلاق کا نمونہ بناتا ہے... اسی کے نمونے پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر قواعد کلیہ اور اصول عام ہوتے ہیں جو قریباً تمام دُنیا کی قوموں میں مشترک ہوتے ہیں۔ تاہم خاص اس قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کی بنا پر قائم ہوتے ہیں۔ ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ ہی ان پر چنداں زور دیا جاتا ہے۔''[۴]

علامہ شبلی مرحوم نے حجۃ اللہ البالغہ کا عربی متن اور اس کا ترجمہ کرنے کے بعد لکھا ہے: ''اس اصول سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ شریعتِ اسلامی میں چوری، زنا اور قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، اُن میں کہاں تک عرب کے رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینھا اور بخصوصھا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔''[۵]

شریعتِ اسلامیہ اور اس کے نفاذ سے متعلق شاہ ولی اللہ اور شبلی کے افکار پڑھنے کے بعد علامہ اقبال نے لکھا: ''شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے پر بصیرت افروز بحث کی ہے۔ میں یہاں ان کے نقطۂ نظر کا بنیادی فکر بیان کرتا ہوں:

''شاہ صاحب کی رائے میں پیغمبر کی تعلیمات کا طریقِ تعلیم عمومی طور پر یہ ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے رسم و رواج اور خصوصیات کو پیشِ نظر رکھتا ہے جن کی طرف وہ مبعوث ہوتا ہے۔ پیغمبر، جن کی تعلیم ہمہ گیر اصولوں پر مشتمل ہوتی ہے، مختلف قوموں کے لیے مختلف اصول بیان نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے لیے لین دین کے قوانین خود مرتب کریں۔ پیغمبر کی تربیت و تعلیم کا طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کی تربیت کرتا ہے۔ پھر اسے ایک آفاقی شریعت کی تشکیل کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس طرح شریعت کے اصولوں کو بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے استعمال کرتا ہے اور لوگوں کی مخصوص عادات کی روشنی میں عملی شکل دیتا ہے۔ شرعی احکام کا یہ طریق نفاذ جو خاص طور پر جرائم سے متعلق ہے، ایک طرح سے اس قوم کے لیے مخصوص ہے، جس کی طرف وہ مبعوث ہوتا ہے۔ چوں کہ ان

Monthly MUHADDIS Lahore
99-J Model Town, Lahore-54700
Phone 0092-42-35866396

احکام کا لحاظ رکھنا بذاتِ خود مقصد نہیں ہوتا، اس لیے آنے والی نسلوں کے لیے لازمی نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جو اسلام کے آفاقی کردار میں خاص بصیرت رکھتے تھے، عملی طور پر روایات پر عمل نہیں کیا۔" [۶]

چنانچہ یہ کہنا حقیقت کے منافی نہ ہوگا کہ پاکستانی سوسائٹی میں ایک فلاحی معاشرہ یا فلاحی ریاست بنائے بغیر سماجی جرائم کی شرعی سزاؤں کا نفاذ مثلاً (چوری میں قطع ید، یا زنا کے جرم میں کوڑے یا رجم کرنا)۔ شاہ ولی اللہ، مولانا شبلی اور علامہ اقبال کی رائے میں فلسفۂ شریعت کے خلاف ہوگا۔

سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳۸ میں چوری کرنے والے مرد اور عورت کی سزا قطعِ ید فرمائی گئی ہے۔ اس آیتِ کریمہ کا ترجمہ کرنے کے بعد مرحوم محمد اسد اپنی معروف تفسیر *The Message of the Quran* میں لکھتے ہیں: "قرآن کی انتہائی سخت سزا کا صحیح ادراک صرف اُسی وقت ہی کیا جا سکتا ہے، جب ایک آدمی اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں کو ذہن میں رکھتا ہے کہ ایک انسان سے کسی فرض (duty) کا مطالبہ اس کے حق (right) کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک شہری سے اس کے فرض (duty) کا مطالبہ اسی وقت کیا جائے گا جب سوسائٹی سے اسے اس کا اپنا حق بھی ملے گا۔ چنانچہ اسلامی سوسائٹی کے ہر ممبر کو مسلمان ہو یا غیر مسلم تحفظ (Protection) کا حق صحیح معنی میں حاصل ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے کئی احکام، ایسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سے جو مستند احادیث میں آئی ہیں، صاف طور پر عیاں ہے۔ چنانچہ سوسائٹی کا ہر شہری، سوسائٹی کے اقتصادی وسائل میں اپنا حصہ رکھتا ہے۔ یعنی اسے سماجی سلامتی (Social Security)، سوسائٹی کے وسائلِ معیشت میں اسے (مرد اور عورت) ایک مناسب معیارِ زندگی کا حق حاصل ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جب تک سوسائٹی ایک فلاحی سوسائٹی نہیں بنتی جہاں ہر شہری کو ایک باوقار زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہو، اس وقت تک چوری کی سزا (قطعِ ید) کا شرعی طور پر نفاذ درست نہ ہوگا۔" [۷] یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی چوری کی سزا قطعِ ید تھی۔ [۸]

اس بات کا ذکر بھی شاید بے محل نہ ہو کہ احادیث کی مستند کتابوں میں ایک صحابی ماعز بن مالک اسلمی کا ذکر آیا ہے جو ایک دفعہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے پاک صاف فرما دیجیے۔ (طھرنی) میں نے زنا کیا ہے! آپ نے یہ سُن کر فرمایا: 'ویحک ارجع فاستغفر اللہ وتب الیہ'۔ نامراد! واپس جائیے اور خدا سے توبہ استغفار کیجیے۔ چنانچہ ماعز چلا گیا، لیکن ضمیر کی خلش نے غریب کا ساتھ نہ چھوڑا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد واپس آ گئے اور کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) 'مجھے پاک کر دیجیے'۔ آپ نے پھر ماعز سے کہا کہ توبہ و استغفار کیجیے۔ وہ چلا گیا، لیکن پھر واپس آ گیا۔ تو آپ نے فرمایا: تمہیں کس چیز سے پاک کر دوں! زنا سے، ماعز نے کہا۔ آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے پوچھا، کیا یہ شخص دیوانہ ہے؟ یہ دیوانہ نہیں ہے، صحابہ نے بتایا۔ آپ نے پھر صحابہ سے پوچھا۔ کیا اس نے شراب پی لی ہے؟ ایک شخص نے ماعز کا منہ سونگھا، لیکن شراب کی بو نہ پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ماعز سے پوچھا کہ شاید تم نے بوس و کنار کیا ہے۔ ماعز نے کہا، نہیں۔ زنا کیا ہے؟ جی ہاں! ماعز نے جواب دیا۔ اس پر آپؐ نے ماعز کو رجم کرنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ جب ماعز پر پتھر پھینکے جا رہے تھے تو وہ جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ مجھے آنحضرتؐ کے پاس لے چلو، وہ مجھے قتل نہیں کریں گے۔ لیکن مارنے والوں نے ایک نہ سنی، اور وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جب آنحضرتؐ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا؟ میرے پاس لے آتے۔ شاید اللہ اس کی توبہ کو قبول کر لیتا۔ [۹]

جب ۱۹۷۹ء میں اسلامی نظریاتی کونسل میں حدود پر بحث و مباحثہ جاری تھا، اس وقت سعودی عرب سے شام کے سابق وزیراعظم اور معروف سکالر ڈاکٹر معروف دوالبی بھی ایک مجلس میں موجود تھے۔ اُنہوں نے حضرت ماعز بن مالک کا مندرجہ بالا واقعہ سنانے کے بعد کہا کہ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک جج کو یہ حق حاصل ہے کہ ملزم کے کوائف و احوال کو سننے اور حالات و ظروف کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ (جج) چاہے تو ملزم کو شرعی سزا دے یا ملزم کو جیل

بھیج دے، یا اسے بری کر دے۔

جب ڈاکٹر معروف دوالبی نے اپنے تبصرہ کو ختم کیا تو خاکسار نے ان کی تائید کی۔ لیکن بعض علمائے کرام (ارکان) نے ڈاکٹر دوالبی کے تبصرے سے اتفاق نہیں کیا۔ خاکسار کی اُس وقت بھی یہ رائے تھی کہ جب تک ایک فلاحی معاشرہ وجود میں نہیں آ جاتا، اُس وقت تک تعزیر کی بجائے رجم جیسی سنگین سزا دینا جائز نہ ہوگا۔

یاد رہے کہ قرآن میں رجم کی سزا کا ذکر نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں خوارج کی جماعت رجم کو نہیں مانتی اور موجودہ وقت میں مرحوم مولانا امین احسن اصلاحی بھی رجم کے قائل نہیں تھے۔ لیکن مرحوم صدر ضیاء الحق کے عہد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے بعض ارکان نے اسلامی قوانین اور ان کے نفاذ سے متعلق تمام پہلوؤں پر غور وفکر سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ حدود آرڈیننس کو تیار کرتے وقت چند پہلو اُن کی نظروں سے اوجھل رہے۔ مثلاً زنا بالجبر کا نشانہ بننے والی مظلوم خواتین سے پولیس نے کہا کہ وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں گواہ پیش کریں ورنہ ''اعترافِ جرم'' میں جیل جائیں۔

چنانچہ زنا بالجبر جیسے سنگین واقعات میں سینکڑوں خواتین کو جیل جانا پڑا اور مجرم سوسائٹی میں آزادی سے گھومتے پھرتے رہے۔ جب خواتین کی ایک بڑی جماعت زنا بالجبر میں جیل پہنچ گئی اور زنا بالجبر کے آثار نظر آنے لگے تو عام لوگوں کو پتہ چلا کہ مظلوم خواتین ناکردہ گناہ کے جرم میں کیا کیا دُکھ جھیل رہی ہیں۔ چنانچہ ان ہولناک واقعات پر نہ صرف خواتین نے آواز اُٹھائی، بلکہ پڑھے لکھے ہزاروں شہری بھی اس المیے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن اسلامی نظریاتی کونسل کے علمائے کرام اس مسئلے کی سنگینی کا ادراک نہ کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر معروف دوالبی نے خاکسار سے کہا کہ ''میں یہاں آنے سے پہلے یہ سمجھتا تھا کہ حکام، اسلامی احکام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ لیکن یہاں آ کر پتہ چلا کہ حکام نہیں بلکہ علماء اسلامی احکام کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔''[۱۰]

ہمیں یقین ہے کہ اگر مرحوم صدر جنرل ضیاء الحق کو پتہ چل جاتا کہ حدود آرڈیننس

سے خواتین کو کیا کیا دُکھ اُٹھانے پڑیں گے، تو وہ اسے جاری نہ کرتے۔ لیکن وہ ریاست کے دوسرے مسائل میں ایسے الجھے رہے کہ اپنے ہی جاری کردہ حدود آرڈیننس کے ہولناک نتائج سے آگاہ نہ ہو سکے۔

یہاں اس واقعہ کا ذکر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک دفعہ مرحوم صدر جنرل ضیاء الحق بلوچستان گئے، وہاں سبی کے مقام پر اُن کی ملاقات جسٹس جاوید اقبال سے ہوئی جو آج کل سپریم کورٹ کے ایک معزز جج ہیں، جسٹس جاوید اقبال اُن دنوں سبی میں سیشن جج تھے۔ صدر صاحب نے ان سے پوچھا کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ سے قیامِ انصاف میں کہاں تک بات آگے بڑھی ہے؟ تو جسٹس جاوید اقبال نے کہا کہ حدود آرڈیننس سے یہاں لین دین کے نرخ بڑھ گئے ہیں، مثلاً آج اگر کوئی فریادی پولیس کے پاس آتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ قطعِ ید سے متعلق قانون میں مقدمہ درج کر دیں یا حالیہ جاری قانون کے مطابق؟ چنانچہ حدود آرڈیننس سے 'رشوت' کا نرخ بڑھ گیا ہے۔ یہ جواب مرحوم صدر موصوف کو پسند نہ آیا۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ جب وہ اسلام آباد واپس گئے تو اُنہوں نے حدود آرڈیننس کے نفاذ اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے متعلق ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا اور متعلقہ حکام سے کہا کہ اس کمیٹی میں بلوچستان میں سبی کے سیشن جج کو ضرور آنا چاہیے۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حدود آرڈیننس کے صحیح نفاذ کے لیے کس قدر سوچ بچار کرتے تھے۔ لیکن اُس وقت کی اسلامی نظریاتی کونسل کے ''نورتن'' یہ سمجھتے رہے کہ حدود آرڈیننس کے خلاف جو آوازیں اُٹھ رہی ہیں اُنہیں سیکولر حلقے ہوا دے رہے ہیں۔ اس امر کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ فروری ۱۹۷۸ء کو اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سابق چیئرمین نے صدر ضیاء الحق کو لکھا: ''مَیں ڈاکٹر رشید احمد کی جدیدیت (Modernism)، مولانا حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) سے بیعت (disciple) یا مولانا ابوالکلام آزاد کے مدّاح (admirer) ہونے اور سیکولرازم پر اس کے عقیدہ کی وجہ سے جس کا مظاہرہ اس نے ۳۱ جنوری ۱۹۷۸ء کو راولپنڈی میں شام ہمدرد کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کیا (غرضیکہ) مَیں

رشید احمد کی جدیدیت (Modernism) اور ترقی پسندی سے خائف نہیں ہوں۔ بلکہ مَیں خود ذاتی طور پر لبرل اور قانونی امور میں عقلی تشریحات کی طرف مائل ہوں — واقعہ یہ ہے کہ فکری آزادی ایک بنیادی حق ہے، جس کی ضمانت ہمارے دستور میں دی گئی ہے۔ لیکن عوام میں حکومت کے ایک اہم ادارے کے صدر (رشید احمد) کا ایسے نظریات کا پرچار کرنا جو نظریۂ پاکستان سے متصادم ہوں، ایک عجیب صورتِ حال کو پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے ڈائریکٹر کو اس ادارہ سے فارغ کر دیا جائے۔'' چنانچہ غریبِ شہر کو ملازمت سے سبکدوش کر کے گھر بھیج دیا گیا۔ بہت دنوں کے بعد خوب جم کر سونے کا موقع ملا۔ غالب نے ٹھیک ہی کہا تھا:

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا ، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

۱۲ر فروری ۱۹۸۰ء کو مرکزی وزارتِ تعلیم سے پیغام ملا کہ آج ۸ بجے شام صدر جنرل ضیاء الحق نے تمہیں بلایا ہے، وزیرِ تعلیم ڈاکٹر محمد افضل بھی وہاں ہوں گے۔

چنانچہ خاکسار وقتِ مقررہ پر جنرل موصوف کے ہاں پہنچ گیا، جہاں ڈاکٹر محمد افضل بھی موجود تھے جو سارا وقت خاموشی سے بات چیت سنتے رہے۔ صدر مرحوم نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا کہ: کیا تم مولانا حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) کے مرید ہو؟ جی نہیں، مجھے میرے والد مرحوم نے تقسیم سے پہلے دارالعلوم دیوبند بھیج دیا تھا۔ خاکسار نے اپنے قیامِ دیوبند میں جن معروف علمائے حق کو دیکھا جو صحیح معنی میں عالم اور درویش تھے، اُن میں ایک مولانا سیّد حسین احمد مدنی ہیں اور دوسرے مولانا شبیر احمد عثمانی۔ خاکسار اپنے قیامِ دیوبند میں ان دو حضرات کی محفلوں میں برابر جاتا رہا۔

''اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین سے تمہارے کیا اختلافات تھے؟'' صدر صاحب نے فرمایا۔

میرا چیئرمین سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ سوائے اس طریقِ کار کے جسے حدود کے نفاذ میں اختیار کیا گیا، جس کی پاداش میں آج ۱۳ سو خواتین جیل میں ہیں۔ وہ انصاف کی تلاش

میں گھر سے نکل کر پولیس کے دفتر گئیں اور بتایا کہ ان کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ کوئی گواہ؟ وہ گواہ کہاں سے لاتیں۔ گواہ تو آج لندن اور پیرس جیسے شہروں میں بھی میسر نہیں آتے۔ چنانچہ وہ جیل پہنچ گئیں کیونکہ اُنہوں نے زنا کا اعتراف کر لیا تھا۔

صدر موصوف (جنرل ضیاء الحق) بات چیت کرنے میں بڑے مہذب تھے اور بڑے غور سے دوسرے کی بات سنتے تھے۔ چنانچہ خاکسار نے کھل کر اُن سے بات چیت کی اور کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران نہیں بلکہ بعض علمائے جمود خود اسلامی احکام کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ صدر صاحب نے فوراً کہا کہ تم نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے اس کی مثالیں دو۔ جواب میں خاکسار نے کہا کہ تین طلاق کا مسئلہ پورے برصغیر پاک و ہند کا اہم سماجی مسئلہ بنا رہا ہے۔ اس سے بڑے مفاسد پیدا ہوئے۔ آج پوری اسلامی دُنیا میں کہیں بھی ایک ہی وقت میں تین طلاق کو مذہبی نقطۂ نظر سے مؤثر قرار نہیں دیا جاتا۔ مرحوم شیخ شلتوت (قاہرہ) نے کہا ہے کہ ہم نے تین طلاق کے مسئلہ پر فقہ جعفریہ کا مسلک اختیار کر لیا ہے۔ برصغیر میں آج بھی جب ایک خاوند طیش میں آ کر طلاق، طلاق، طلاق کا لفظ بولتا ہے تو بیوی کو اپنے سابق خاوند کے پاس رہنے کے لیے ''حلالہ'' جیسی مکروہ رسم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس مکروہ اور شرمناک صورتِ حال پر مرحوم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب حقوق الزوجین میں بڑے مؤثر انداز سے لکھا ہے۔ لیکن جب ۱۹۶۱ء میں مرحوم صدر محمد ایوب خان نے مسلم سکالرز سے مشورہ کرنے کے بعد اصلاحات کا اعلان کیا، تو ان میں ایک ہی مجلس میں دی گئی 'طلاقِ ثلاثہ' کو مؤثر قرار نہیں دیا گیا۔ اس پر مولانا مودودی مرحوم نے فرمایا کہ مسلمانوں کا جو گروہ (حنفی حضرات) اسے نہیں مانتا، اس پر یہ اصلاحی فرمان جاری نہیں ہونا چاہیے۔[۱۱]

مولانا سیّد مودودی نے نہ صرف حقوق الزوجین میں 'طلاقِ ثلاثہ' کے خلاف لکھا، بلکہ یہ بھی لکھا ''جہاں عورتوں اور مردوں کی سوسائٹی مخلوط رکھی گئی ہو، جہاں مدرسوں میں، دفتروں میں، کلبوں میں اور تفریح گاہوں میں — عورتوں کو آزادانہ ملنے جلنے اور ساتھ اکٹھے بیٹھنے کا موقع ملتا ہو، جہاں — ازدواجی رشتے کے بغیر خواہشات کی تسکین کے لیے ہر قسم کی سہولتیں

موجود ہوں... ایسی جگہ زنا، قذف کی شرعی حد جاری کرنا بلاشبہ ظلم ہوگا۔''[۱۲]

وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ آج کل قومی اسمبلی میں حکومت تحفظِ حقوقِ نسواں کے نام پر ایک بل پیش کرنا چاہتی ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ اس بل کی مخالفت میں پیش پیش وہ ارکانِ اسمبلی بھی ہیں جو مولانا سیّد مودودی مرحوم سے عقیدت رکھتے ہیں۔

یہاں اس واقعے کا ذکر شاید بے جا نہ ہوگا کہ جب ۱۹۲۷ء میں برصغیر کی مرکزی اسمبلی (دہلی) میں ایک ہندو ممبر شاردا نے چھوٹے بچوں کی شادی کو روکنے کے لیے ایک بل پیش کیا، تو بعض مسلم ممبروں نے نہ صرف حمایت کی بلکہ یہ بھی کہا کہ یہ شاردا بل مسلم بچوں اور بچیوں پر بھی لاگو ہونا چاہیے۔ اس بل کی حمایت میں بانیٔ پاکستان بھی تھے، جو اُس وقت اسمبلی کے ایک معزز ممبر تھے، اُنہوں نے اس بل کی پُرزور حمایت کی۔ لیکن علمائے کرام نے اس بل کے خلاف پورے برصغیر میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ لاہور، دہلی، اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں سینکڑوں کی تعداد میں بچے، بچیوں کی شادیاں کرانے کے لیے علمائے کرام اور صوفیائے عظام میدان میں اُتر آئے۔ اس پُرآشوب دور میں مسلمانوں میں سے جن تین اہلِ نظر نے محمد علی جناح کی حمایت میں آواز بلند کی وہ تھے: ثناء اللہ امرتسریؒ، خواجہ حسن نظامیؒ اور ابوالکلام آزادؒ۔ لیکن آج وقت نے بتا دیا ہے کہ ہمارے سماجی مسائل کا حل سنجیدہ سوچ بچار میں پنہاں ہے، ہنگامے اور مظاہرے ہمارے مسائل کا حل نہیں ہیں۔

صدر موصوف نے نفاذِ حدود سے متعلق خاکسار کے خیالات سننے کے بعد کہا کہ تم دوبارہ سرکاری ملازمت میں واپس آ جاؤ۔ خاکسار نے اُن سے کہا کہ وہ مجھے بلوچستان یونیورسٹی میں جانے کی اجازت دے دیں۔ بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر بریگیڈیئر آغا اکبر شاہ نے مجھے یونیورسٹی میں آنے کی پیش کش کی ہے۔ چنانچہ صدر صاحب مرحوم نے مجھے وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ خاکسار جب اُن سے رخصت ہونے لگا تو اُنہوں نے فتاوی عالم گیریہ (جو اُن کے shelf میں پڑی تھی) کے بارے میں کہا کہ فلاں عالم... نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کے توسط سے ۶ ماہ میں پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوسکتی

ہے۔تمہاری کیا رائے ہے؟

'افسوس! مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں''، خاکسار نے کہا۔ کیوں؟ یہ کتاب مرحوم اورنگ زیب عالم گیر نے لکھوائی تھی۔ جس پر دو (۲) لاکھ روپیہ خرچ آیا تھا اور شاہ عبدالرحیم نے اپنی والدہ کے کہنے پر اس کتاب سے متعلق بورڈ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ نیز اورنگ زیب کی وفات کے صرف ۲۷ سال بعد نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر دیا اور جی بھر کر دہلی کو تاراج کیا اور لوٹا۔ الغرض یہ کتاب مغلوں کو برباد ہونے سے نہیں بچا سکی، ہماری تعمیر میں یہ کیا رول ادا کر سکتی ہے؟ میں نے جواب دیا۔ اتفاق سے اُنہیں یہ جواب پسند آیا۔ اُنہوں نے ڈاکٹر محمد افضل سے کہا کہ یہ بات تو اس (رشید احمد) نے صحیح کی ہے۔

اس ملاقات کے اختتام پر صدر مرحوم نے کہا کہ تم شریعتِ اسلامیہ اور اس کے نفاذ سے متعلق تفصیل سے ایک مقالہ لکھ کر مجھے دو''اور بتاؤ ہماری خواتین کو کن کن مشکلات کا سامنا ہے''۔ خاکسار نے اس موضوع پر''شریعتِ اسلامی اور اس کی تعبیر وتشریح کا مسئلہ'' کے عنوان سے ایک مستقل مقالہ لکھا جو بلوچستان یونیورسٹی کی شائع کردہ ایک کتاب:''قرآن مجید: اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ'' میں شائع ہوا۔ اب اس کا انگریزی ترجمہ "The Concept of Islamic Shari'a and Its Application with Special Reference to Pakistan" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے سماجی مسائل کو شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں کیونکر حل کریں؟ اس مقالہ میں برصغیر کے معروف علماء اور اصحابِ فکر مثلاً علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، اور سیّد رشید رضا کے افکار زیرِ بحث آئے ہیں۔ حدود آرڈیننس کا بنیادی مقصد یہی تھا۔ لیکن ہم یہ بات بھول گئے کہ''یک من علم را دہ من عقل باید'' (ایک من علم کے لیے دس من عقل کی ضرورت ہے) افلاطون نے سچ کہا تھا کہ سوسائٹی میں جو بدنظمی یا انتشار پایا جاتا ہے، وہ دراصل ہماری ژولیدگیٔ فکر کا عکس ہے۔ چنانچہ زندگی کی بلند قدروں: سچائی، دیانت کو اپنانے اور جھوٹ، نفرت اور مکر وفریب سے دوری کے بغیر ہم اخلاقی زندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ یہ سب باتیں صحیح اور بامقصد تعلیم سے آتی ہیں، صرف

قانون کے لٹھ سے ہم ایک انسان کو اخلاقی انسان نہیں بنا سکتے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے ہم ''حدود آرڈیننس'' جاری کرتے ہوئے بھول گئے۔

حواشی:

(۱) دیکھیے: ڈاکٹر محمد خالد مسعود:
"The Hudood Ordinance 1979" , The Council of Islamic Ideology, Govt. of Pakistan, 2006, p.2.

(۲) ''حجۃ اللہ البالغہ''، قاہرہ، ۱۳۲۲ھ، ج I، ص ۷۱۔ مولانا شبلی نعمانی: ''علم الکلام''، کان پور نامی پریس، ج ۲، ص ۱۱۰۔

(۳) ''حجۃ اللہ البالغہ''، ج I، ص ۷۱؛ علم الکلام، ج ۲، ص ۱۱۰-۱۱۱۔

(۴) شبلی: ''علم الکلام''، ج ۲، ص ۱۱۳۔

(۵) ایضاً، ص ۱۱۵۔

(۶) "The Shari'a values (*Ahkam*) resulting from this application (e.g. rules relating to penalities for crimes) are in a sense specific to that people; and since their observance is not an end in itself they cannot be strictly enforced in the case of future generations." (*The Reconstruction of Religious Thought in Islam* , Ed. M. Saeed Sheikh, Lahore, p.136-37).

(۷) *The Message of the Quran* , Gibraltar, 1980, pp.149-150.

(۸) محمد حبیب البغدادی: کتاب المحبر، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۲ء

(۹) تفصیل کے لیے دیکھیے، سنن ابی داؤد، قاہرہ ۱۹۵۱ء، تحقیق محی الدین عبدالحمید، ج ۴، ص ۲۰۵۔

(۱۰) قبل القدوم إلى الباكستان، إنّى كنتُ أعتقد إن الحكّام يعرقلون النظام الاسلامى ولكن ألان انا أعتقد أن العلماء يُعرقلون النظام الاسلامى.

(۱۱) ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۴۱-۴۲۔

(۱۲) تفہیمات، ج ۲، ص ۳۳۸، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

ڈاکٹر رشید احمد (جالندھری)